اُردو غزل قیام پاکستان کے بعد (ایک جائزہ)

ڈاکٹر شائستہ حمید خان، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی لاہور

Abstract

After the establishment of Pakistan, Ghazal was undoubtly taken as a strong style of literature in the world of Urdu literature. In Urdu Ghazal, with the new topics, new meanings and contemporary affairs; in internal style of Ghazal, decorative language and subject matter was becoming popular. And in the new state like Pakistan, the adventures of contemporary life have been vociferously presented. And the situations of human problems of that era have been successfully presented in the genre of Urdu Ghazal. This research paper also indicates the loss and gain of Urdu Ghazal after the establishment of Pakistan.

غزل کا شمار اُردو شاعری کی اہم ترین صنف میں ہوتا ہے۔ اس میں شاعر ہجر و صال کے قصے، پیار و محبت کی داستان اور موزوں خیالات کو مناسب الفاظ میں بیان کرتا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

> ''تاثرات کی انتہاؤں یا منتہاؤں کا مترنم خیالات یا محسوسات بن جانا اور مناسب ترین یا موزوں ترین الفاظ و انداز بیان میں ان کا صورت پکڑ لینا ہی غزل ہے۔''[۱]

اُردو غزل نے ابتدا سے قیام پاکستان تک ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ زبان و بیان، فکر و احساسات، موضوعات گو ہر قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور غزل کا دامن مزید وسیع ہوتا چلا گیا لیکن جو اثرات تہذیب و تمدن اور زبان کی تقسیم سے غزل پر مرتب ہوئے وہ کافی گہرے تھے۔ اس ضمن میں ممتاز الحق لکھتے ہیں:

> ''تقسیم ہند کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی جو لہر چلی وہ اب تک رکنے کا نام نہیں لیتی۔ ان فسادوں نے اپنے ہی ملک کے بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ دوری اور اجنبیت بڑھتی چلی گئی۔ تعصّب اور نفرت کی آندھیوں نے مشترکہ تہذیب کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس کی لپیٹ میں مذہب، زبان، کلچر اور دوسرے سماجی ادارے بھی آ گئے۔ مذہبی بنیاد کی بنا پر زبان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا گیا اور اس کی جڑیں کاٹنے کی کوشش ہوتی رہی مذہبی رواداری ختم ہو گئی''۔[۲]

قدیم غزل کا محبوب تہذیب و تمدن کا نمائندہ تھا۔ جب تہذیب ٹوٹ پھوٹ گئی تو وہ پہلا سا عشق بھی نہ رہا اور قیام پاکستان کے بعد ترقی پسند بیشتر شعراء کا ردعمل بہت شدید رہا۔ یہ تحریک اپنے قیام (۱۹۳۶ء) سے ہی برصغیر کی آزادی کو اپنا نصب

العین مجھتی رہی مگر جب ۱۹۴۷ء کو ہند کے مسلمان آزادی سے سرفراز ہوئے اور اپنے وطن پاکستان میں ہجرت کر کے آئے تو اکثر و بیشتر نے اس آزادی کو آزادی نہ سمجھا۔علی سردار جعفری نے آزادی کے حوالے سے ناخوشگوار اظہار کیا اور اس طرح کا تلخ اور ناپسندیدہ طرزِ فکر اور احساس ہمیں دیگر شعراء میں بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً:

فریب دے کر حیاتِ نو کا، حیات ہی چھین لی ہے ہم سے
ہم اس زمانے کا کیا کریں گے، اگر یہی ہے نیا زمانہ

(علی سردار جعفری)

صدیوں کی جانکاہی سے بھی ہم جس کو سلجھا نہ سکے تھے
تو نے اپنی تدبیروں سے اس الجھن کو اور الجھایا
مایوسی میں عمر کٹی تھی اس نے انگڑائی سی لی تھی
سوچا تھا قسمت بدلے گی لیکن ہم نے دھوکہ کھایا

(احمد راہی)

زمیں نے خون اگلا آسمان نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری
چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت ہوگئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

اس طرزِ فکر کو دیکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے ترقی پسند تحریک کو ایک سیاسی تحریک قرار دے دیا مگر اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں کہ ترقی پسند تحریک کے تحت جو ادب تخلیق ہوا اس میں زندگی کی تصویر کے ساتھ ساتھ تنقید بھی موجود تھی اس ضمن میں ڈاکٹر انور صابر لکھتے ہیں:

’’ترقی پسندوں کا مطالبہ تھا کہ غزل کو بھی دوسری اصنافِ ادب کی طرح حقیقی زندگی کے رنج و راحت کا ترجمان و عکاس ہونا چاہیے۔ انہیں غزل کے فنی اور ہیئتی لوازمات کی بجائے غزل کے موضوع اور مضامین و مواد پر اعتراض تھا اور ترقی پسندوں کا استدلال تھا کہ غزل کو زندگی کے انفرادی اور اجتماعی ارتقاء کے عمل میں اپنا مثبت اور بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔ تقسیم سے پہلے اور بعد میں اس حوالے سے اجتہاد کرنے والے شعرا میں فیض، ظہیر کاشمیری احمد ندیم قاسمی اور عارف عبدالمتین کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء نے پاکستان میں ترقی پسند فکر کی شمع کو روشن رکھا، ہجرت اور فسادات کے علاوہ سیاسی، جمہوری، معاشی کشمکش برصغیر اور بین الاقوامی سطح پر انسان کشی کے حوالے سے غزل کے کینوس کو وسعت دی۔ حسن و عشق کے روایتی استعاروں اور علامتوں کو نئی معنویت عطا کی اور پاکستان جیسی نئی مملکت میں عصری زندگی کے جاندار مرقعے پیش کیے۔ اس دور کے انسانی مسائل کی صورت حال کو اُردو غزل کے قالب میں کامیابی سے ڈھالا‘‘[۳]

فیض احمد فیض قیام پاکستان کے بعد اُردو غزل کے نامور شاعر ہیں۔ ان کے ہاں جہاں جذبۂ عشق بہت پہلو دار ہے وہاں حسن پرستی رومانوی اثرات کی حامل ہے۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے　　چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

فیض کی شاعری کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ رومانوی تحریک کے زیر اثر فیض کی غزل میں نرمی اور ملائمیت کی چمک تو ہے مگر استعاروں اور علامتوں میں سیاسی معنویت بھرپور انداز سے نمایاں ہے۔ بقول غفور شاہ قاسم:

> ''فیض کی شاعری بیک وقت رومانی بھی ہے اور سیاسی بھی۔ ایک نقاد کے بقول ان کی رومانی شاعری پر سیاسی شاعری کا دھوکہ ہو یا نہ ہو لیکن ان کی سیاسی شاعری پر رومانی شاعری کا دھوکہ ضرور ہوتا ہے۔ ان کے یہاں غزل کی عشقیہ علامت قفس، صیاد، ساقی، گلشن ناصح وغیرہ سیاسی معنوں میں استعمال کی گئی ہیں''[۴]

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کُوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

☆

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو غزل میں حلقہ ارباب ذوق کے شعراء نے بھی خاص رویہ اپنایا یعنی ماحول کی اداسی آشوب انتشار اپنی ذات میں مدغم کر لیا۔ ناصر کاظمی کے علاوہ یوسف ظفر، قیوم نظر، اختر ہوشیار پوری، ممتاز صدیقی اور انجم رومانی کی شاعری میں یہ رویہ بہت نمایاں ہے:

نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا

(میراجی)

کچھ ترا کچھ غمِ زمانہ تو ہے
جی رہا ہوں کوئی بہانہ تو ہے

(یوسف ظفر)

تیز تھی اتنی کہ سارا شہر خالی کر گئی
دیر تک بیٹھا رہا میں اس ہوا کے سامنے

(منیر نیازی)

غمِ جاناں ہو کہ غمِ دوراں ہو
کچھ بھی اب تیرے سوا یاد نہیں

(اختر ہوشیار پوری)

احمد ندیم قاسمی کے ہاں مثالی انسان ملتا ہے۔ وہ روایت و تجربات کی حدود میں رہ کر نئے موضوعات غزل کو دے گئے۔ ان کے ہاں کہیں فکری سطح پر اقبال کی گونج ملتی ہے۔ کبھی لہجہ جلالی کی بجائے جمالی ہو جاتا ہے اور ان کے ہاں اگر محبوب عظیم ہے تو عاشق عظیم تر ہے یہی لہجہ وطرز ان کو منفرد بنا دیتی:

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے　　مرحلہ طے نہ ہوا تری شناسائی کا
ہر نئی بزم تیری یاد کا ماحول بنی　　ہم نے یہ رنگ بھی دیکھا تری یکتائی کا

عابد علی عابد نے کلاسیکی شاعری و روایت کو وسعت سے نوازا۔ ان کے ہاں نئے عہد کا انسان پوری طرح داخل نہیں ہو سکا۔ ان کے ہاں خوبصورت لفظی تصویریں اور موسیقی کے سُر بھی ملتے ہیں۔

منیر نیازی نے موضوعات اور لفظیات کے معاملے میں غزل کی روایت میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ ان کے ہاں خوف سے تعلق رکھنے والی کئی علامات جہاں شہر کی ہولناکیوں کا چہرہ دکھاتی ہیں وہاں درد، بغاوت، ہجرت کا دکھ اور عشق و عاشقی میں ارضی سطح کی بھی نمائندگی کرتی ہیں:

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کہا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا
میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد
پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اس نے کیا
راہبر میرا بنا گمراہ کرنے کے لیے
مجھ کو سیدھے راستے سے دربدر اس نے کیا
شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا
پھر اس شہر میں نامعتبر اس نے کیا
شہر کو برباد کرکے رکھ دیا اس نے منیرؔ
شہر پر ظلم میرے نام پر اس نے کیا

احمد فراز کے ہاں فیض کی آواز اور کئی جگہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔ عشق میں حقیقت پسندی کا رجحان رکھتے ہیں۔ وہ کوئے یار سے سوئے دار کی سب کیفیات بیان کرتے ہیں۔ وطن کا کرب احساس اور وطن پرستی بھی ان کے ہاں ملتی ہے:

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یک جا کیا
ورنہ میں تیرا نہ تھا اور تو میرا نہ تھا

☆

زندہ دلانِ شہر کو کیا ہو گیا فرازؔ
آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے

ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجرت کا تجربہ اور کرب ملتا ہے۔ اپنے دور کی لاحاصلی کا صدمہ، اداس لہجے، شہر کی خامشی،

سیاسی جبر، گھٹن، تہذیبی آشوب یہ سب ناصر کی شاعری کا خاص پہلو ہے۔ راستہ، رات، سفر اور کارواں جیسی علامتیں ان کی شاعری کی پہچان ہے:

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
وہ قافلہ جو میرا ہم سفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ

☆

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا اب باہر جاؤں کس کے لیے

ڈاکٹر سہیل احمد ناصر کاظمی کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

> ''ناصر کا کمال یہ ہے کہ اس نے فطرت کے مظاہر اور تہذیبی آشوب کو گھلا ملا کر ایسا مہذب لہجہ نکالا، جس کی کسک دیر تک محسوس ہوتی ہے۔ تہذیبی آشوب کو فطرت کے حوالے سے بیان کرنے کا انداز کلاسیکی غزل کا اہم رجحان ہے مگر اپنے زمانے میں ناصر نے اسے اپنی شاعرانہ صناعی کا مستقل حصہ بنا کر اسے ایک نئے طرزِ احساس کی حیثیت دے دی ہے۔''۵

ناصر کی شاعری کے اس رنگ کو میر تقی میر کے ساتھ بھی وابستہ کیا گیا۔ ناصر کی رات کو میر کے عہد کی رات سے تشبیہ بھی دی گئی کیونکہ دونوں شعراء حالات کی اسی کڑی پر کھڑے تھے۔ نظیر صدیقی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> ''۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے شعراء میر کی طرح ایک پر آشوب دور اور تہذیبی بحران سے گزرے اس لیے دونوں کے تجربات میں بڑی مماثلت ہے جس نے میر پرستی کی شکل اختیار کی، معلوم نہیں نفسیاتی اعتبار سے یہ توجیہہ کہاں تک صحیح ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ۱۹۴۷ء کے المیہ میں جو لوگ جسمانی زخموں کی تاب نہ لائے اور مر گئے اور جو بچ رہے انہیں اپنے روحانی زخموں کا علاج میر ہی کے یہاں نظر آیا''۶

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ　　یہاں جو حادثے کل ہوگئے ہیں
(ناصر کاظمی)

سلیم احمد نے اپنی شاعری میں علامتوں اور تلمیحات کے ذریعے ایک نیا پیغام دیا۔ جہاد اور خیر و شر کی علامتیں ان کی شاعری کا خاص موضوع رہی ہیں۔

نیا مضمون کتابِ زیست کا ہوں
نہایت غور سے سوچا گیا ہوں
وہ رن مجھ میں پڑا ہے خیر و شر کا
کہ اپنی ذات میں اِک کربلا ہوں

سلیم احمد نے سقوطِ ڈھاکہ کے المیے کو بھی پوری طرح محسوس کیا ہے۔ اس نے اس شکست کی معنویت کو کربلا کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور یہاں پر بہنے والے خون کو بھی کربلا کے حوالے سے سمجھا ہے:

رشتہ میری زمین کا بھی ہے کربلا کے ساتھ　　ہونا ہے اس کو خون شہیداں سے تربتر

سلیم احمد کے ہاں فکر کی ماورائیت کے ساتھ ساتھ خالص زمینی حوالے بھی ملتے ہیں۔ شہر کا سناٹا، خاموشی، زندگی کی معنویت اور عشق کی خالص زمینی سطح بھی ملتی ہے جس میں رنگ، حرارت ذائقہ اور لمس کی حیات واضح ہیں۔ آپ نے زبان اور اظہار کے حسن کا بھی خاص خیال رکھا اور شاعری کو ایک تازگی بخشی۔

قیامِ پاکستان کے بعد حبیب جالب کا ردعمل بڑا شدید تھا۔ غزل کے داخلی مزاج کے سوز و گداز کو جب خارجی ماحول کے افسوسناک حوادث سے غذا حاصل ہوئی تو ان کی غزلیں سحرکاری بن گئیں:

روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں　　حیرت سی برستی ہے دَر و بام پہ ہر سُو

ابن انشا کی شاعری میں اداسی کا رنگ ملتا ہے اور یہ اداسی ہمیں میر کے عہد کی یاد دلاتی ہے:

صبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا　　اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا

عبیداللہ علیم اپنی ذات اور زمانے کا شاعر ہے۔ تہذیبی قدریں ٹوٹنے کا غم، صاحبانِ جنون اور اہل کشف و کمال کے مٹ جانے کا دکھ علیم کی غزل میں موجود ہے۔ انہیں محبوب سے محبت تو ہے مگر محبوب کی شرائط پر دوستی کرنے کو تیار نہیں۔ دوسری طرف محبوب کی یاد میں تڑپتے بھی ہیں اور اسے یاد بھی کرتے ہیں:

میں اس کو بھول گیا ہوں وہ مجھ کو بھول گیا
تو پھر یہ دل پہ کیوں دستک سی ناگہانی ہوئی

☆

محبتیں بھی عجب اس کی، نفرتیں بھی کمال
میری ہی طرح کا مجھ میں سما گیا اک شخص

ڈاکٹر انور سدید اس ضمن میں لکھتے ہیں:

”آزادی کے بعد کی غزل میں عصری رجحانات کو لپیٹ میں لینے کا رجحان بے حد نمایاں ہے۔ نئے تقاضوں نے عشق کرنے کا انداز تبدیل کر دیا“[۷]

سجاد باقر رضوی نے بھی قیام پاکستان کے بعد کے حالات کی بے معنی صورت حال میں معنویت کی تلاش کی ہے۔ اس سفر میں ان کا جذبہ عقل سے متصادم نہیں ہم آہنگ ہے۔ محبوب کے کوچے کی خوشبو بھی آپ کی شاعری میں موجود ہے۔ باقر صاحب کی غزلیں فنی لحاظ سے کامیاب غزلیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان میں الفاظ کی نشست، معنی اور آہنگ کا رشتہ ایسا ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

خواتین شاعروں میں ادا جعفری کو اُردو شاعری کی خاتونِ اول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے اظہار کا دائرہ وسیع ہے۔ انہوں نے شاعری میں اپنی الگ پہچان کرائی ہے۔ کشور ناہید نے شاعری میں عورت ہونے کے ناطے سے اپنی الگ پہچان پیدا کی۔ فہمیدہ ریاض کے ہاں عورت خوشبو کا استعارہ بن گئی۔ پروین شاکر کے ہاں عورت کا عورت پن تو ہے مگر بے باکی نہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو شعراء نے غزل میں بہت سے موضوعات کا اضافہ کیا اور رنگ و آہنگ میں بھی نت نئے

تجربات کیے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''اُردو شاعری کسی عہد میں بھی اپنے گردوپیش اور اس کے محرکات سے بے تعلق نہیں رہی وجہ یہ ہے کہ شاعری آج کی ہو یا کل کی اپنے معاشرے کے بطن سے جنم لیتی ہے اور معاشرہ اپنے سیاسی وسماجی عوامل و موثرات کے تحت لحہ بہ لحہ بدلتا رہتا ہے۔'' ۸

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو ادب میں غزل کو بلاشبہ توانا صنفِ ادب کہا جا سکتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مذکورہ شعراء کے علاوہ جن دوسرے پاکستانی شعراء نے غزل میں اپنے الگ لہجے کی پہچان کرائی ان کی فہرست خاصی طویل ہے بہرحال چند ایک نام جن میں حفیظ ہوشیار پوری، ابن انشاء، ظہیر کاشمری، اطہر نفیس، مجید امجد، ممتاز صدیقی، باقی صدیقی، فارغ بخاری، شہرت بخاری، حمایت علی شاعر، محسن احسان، احمد مشتاق، ظفر اقبال، شکیب جلالی، صابر ظفر، امجد اسلام امجد، ذوالفقار احمد اور تابش وغیرہ نے غزل میں نئی حسیّت اور نئی معنویت پیش کرنے کی کامیاب سعی کی۔ اس ساری بحث کو ہم طارق ہاشمی کے اس اقتباس پر ختم کرتے ہیں کہ:

> ''غزل محض صنف شاعری نہیں بلکہ ایک تہذیبی ادارہ بھی ہے اور ۴۷ء کے بعد اس کی نشاۃ الثانیہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی افادیت ہر دور میں مسلم ہے......۴۷ء کا سال آزادی کی نوید بھی ہے اور غزل کی نشاۃ الثانیہ کی ساعت بھی۔'' ۹

حواشی:

۱۔ فراق گورکھپوری، ڈاکٹر، غزل کی ماہیت وہیئت، مشمولہ: ''فن اور تنقید'' مرتبہ: انور کمال حسینی، دہلی: خرام پبلی کیشنز، ۱۹۶۶ء، ص: ۱۹۳

۲۔ ممتاز الحق، ڈاکٹر، جدید غزل کا فنی سیاسی وسماجی مطالعہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۸ء، ص: ۷۱، ۷۲

۳۔ انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو غزل کا ارتقاء، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۹۳

۴۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب شاخت کی نصف صدی، تحقیق وتنقید، راولپنڈی دیز پبلی کیشنز، ص: ۵۳

۵۔ سہیل احمد، ڈاکٹر طرزیں، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص: ۷۶

۶۔ نظیر صدیقی، جدید اُردو غزل، ایک مطالعہ، لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۴ء، ص: ۲۱۵

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر بر سہیل تنقید، لاہور، مقبول اکیڈمی شاہراہ قائد اعظم، ۱۹۹۰ء، ص: ۷۶

۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ، لاہور: معراج الدین پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۶

۹۔ طارق ہاشمی، اُردو غزل نئی تشکیل، راولپنڈی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء، ص: ۹۶، ۹۷